اورینٹل کالج میگزین، جلد۹۸، شمارہ۳، مسلسل شمارہ:۳۶۹، سال ۲۰۲۳ء

طرفۃ الفقہا: جنوبی ایشیا میں فقہِ حنفی کی ایک گم نام مثنوی

گوہر اقبال
لیکچرار فارسی
گورنمنٹ اسلامیہ گریجوایٹ کالج سول لائنز، لاہور
غلام مصطفیٰ
پی ایچ۔ڈی سکالر (علوم اسلامیہ)، نیشنل کالج آف بزنس ایڈ منسٹریشن اینڈ اکنامکس، ملتان کیمپس

TURFATUL FUKAHA AN UNKNOWN MATHNAVI
OF HANAFI FIQH IN SOUTH ASIA

Gohar Iqbal
Lecturer in Persian
Govt. Islamia Graduate College, Civil Lines, Lahore
Ghulam Mustafa
PhD Scholar (Islamic Studies)
NCBA&E, Sub- Campus, Multan

Abstract

Allama Rukan ud din Dehlvi is a spiritual disciple of famous Sufi Hazrat Naseer al-Din Charagh e Dehli who belongs to a mystic school i.e. Chishti Nizami. He wrote a voluminous Mathnavi *Turfatul Fukaha* on Islamic Jurisprudence (Fiqh) in Feroz Shah Tuglaqs reign. The book is directly related with Hanafi fiqh, but there are some disagreements on some fiqhi problems with other school of Islamic jurisprudence. The poet writes about his great teachers and his Sheikh Naseer ud Din. He also describes the ambience of his monastery. He calls his Mathnavi a book of advice. The book consists of 335 chapters and there are 15200 verses in this book. This significant source was completed in 1383. The present research paper aims to provide a detailed evaluation and analysis of this great and forgotten book.

Keywords:

Allama Rukan al-Din Dehlvi, Chishti Nizami, Mathnavi, Hanafi Fiqh, Turfatul Fukaha.

علّامہ رکن الدین دہلوی جنوبی ایشیا کے ایک اہم مگر تاحال گم نام عالم دین، فقیہ، صوفی باصفا اور فارسی کے قادر الکلام شاعر ہیں۔ قدیم تذکروں میں کہیں بھی ان کے تفصیلی احوال و کوائف کا ذکر نہیں ملتا۔ وہ چشتی نظامی سلسلے کے مشہور شیخ طریقت حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلی (۱۲۷۴-۱۳۵۶ء) کے مرید اور بہ راہ راست شاگرد ہیں۔ انھوں نے اپنی خداداد شعری صلاحیتوں کو اسلامی فقہ کے لیے وقف کر دیا اور سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت (۱۳۵۱-۱۳۸۸ء) میں **طرفۃ الفقہا** کے نام سے ایک طویل فقہی مثنوی لکھی جس کی بنیاد حنفی دبستانِ فقہ پر استوار ہے۔ حیرت اور تاسف ہے کہ اتنا پرانا اور اہم علمی وادبی ماخذ ابھی تک موضوعِ تعارف و تجزیہ و تحقیق کیوں نہ بن سکا۔

صاحبِ مثنوی نے اپنے احوال اور اس اہم فقہی ماخذ کے متعلق کچھ معلومات بہم پہنچائی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان فیروز شاہ تغلق ان کے تبحّر علمی اور زہد و تقوی کی وجہ سے ان کا بہت احترام کرتا تھا۔(۱) تذکرہ نگاروں نے اس بادشاہ کو حلیم الطبع اور عدل پسند حکم ران قرار دیا ہے۔ علّامہ رکن الدین بھی ان کے عدل و انصاف کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

دادِ او کرد عالمی آباد   عدل کندید ظلم را بنیاد(۲)

(اس بادشاہ کی انصاف دوستی نے دنیا کو آباد کیا، اور اس کے عدل نے ظلم کی بنیاد کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔)

رکن الدین، اپنی منکسر المزاجی اور چشتی مشرب کی ترجیحات کے باعث کبھی درباری مشاغل کا حصہ نہ بنے، لیکن اپنے عہد کے اربابِ بست و کشاد سے ان کے تعلقات ضرور رہے ہیں۔ وزرا اور مشیروں سے ان کے اچھے روابط کے شواہد، نامۂ صد و بیست و سوّم در نصیحت عتق اور نامۂ دویست و ہشتاد و نہم در دیباچۂ اکراہ میں موجود ہیں۔

وہ اپنے پیر و مرشد شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کا والہانہ ذکرِ خیر کرتے ہیں اور انھیں خراجِ محبت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قطبِ عالم نصیرِ ملت و دین   مہر نُہ چرخ و ماہِ ہفت زمین
در تنِ مردہ جان در آوردی   ہمچو عیسیٰ اگر دعا کردی(۳)

(قطبِ عالم نصیر الملت والدین آسمانوں اور زمینوں کے سورج اور چاند ہیں، انھوں نے اپنی دعا سے مردہ جسموں میں حضرت عیسیٰ کی طرح روح پھونکی۔)

وہ مرشد کی لب ریزِ معانی گفت گوؤں کو نصیحت کا درجہ دیتے ہیں اور ان کے نصائح کو متن کی زینت بناتے ہیں۔ مثنوی میں شیخ کے مریدین و خلفا کے خصائل و شمائل اور خانقاہِ شیخ کا ذکر بھی موجود ہے۔اس بار گاہ میں اپنی حاضری اور وارداتِ قلبی کا مختصر احوال بھی دیا گیا ہے۔ ایک جلیل المرتبت چشتی خانقاہ جہاں استخواں فروشی اور جلبِ زر کا کہیں کوئی نام ونشان نہیں تھا اس کی نورانی فضا کاذکر یوں کرتے ہیں:

ہر طرف درس ہا ز فقہ و اصول — ہر طرف ذکر از خدا و رسول(۴)

(خانقاہ میں جگہ جگہ فقہ اور اصول کا درس دیا جاتا ہے، وہاں ہر طرف خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا ذکرِ خیر ہے۔)

چشتیوں کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ وہ اہل بہشت میں سے ہیں۔ اگر کوئی شخص ابدی نجات چاہتا ہے تو اسے ان کے دامن سے وابستہ ہو جانا چاہیے:

ہر کہ در سلکِ چشتیان باشد — از میانِ بہشتیان باشد(۵)

(چشتیوں کے سلسلے سے وابستہ ہر شخص اہل بہشت میں سے ہوتا ہے۔)

رکن نے تحصیلِ علم کے لیے مختلف علاقوں کا سفر بھی کیا۔ اس سلسلے میں درپیش مصائب و شدائد کا ہمت سے سامنا کیا۔ شاعر نے اپنے اساتذہ کا ذکرِ جمیل بھی کیا ہے اور ہر ایک کا میدانِ تخصص بھی بیان کیا ہے، جس سے متن کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔ ان اساتذہ کے نام و القاب ذیل میں دیے گیے ہیں:

احمد منطقی، حاجی تاج الدین محمد المعروف تاج الشریعت، حَبَل الدین، شیخ جہان، شیخ شرف الدین غوری، عبد المقتدر، قاضی علم الدین، قطبِ عالم، مخدوم اشرف ناوی، نظام ملک۔

شاعر کے بہ قول یہ سبھی متبحّر علما، مشائخِ اخیار کی یاد گار، علمِ تفسیر و حدیث اور منطق پر کامل دست گاہ کی حامل شخصیات ہیں۔ دیگر علوم وفنون کی طرح فنِّ خطابت میں بھی غیر معمولی جوہر رکھتے ہیں۔ رکن اپنے بعض اساتذہ کو مقتدائے مدرسانِ جہاں(۶) اور آفتابِ سپہرِ نعمانی(۷) قرار دیتے ہیں۔ یقیناً یہ سب حنفی فقہ سے وابستہ ہوں گے۔

انھوں نے ایک جگہ دہلی میں اپنے محلّے کے ایک خوب صورت اور ابرار سیرت امام کا ذکر بھی کیا ہے جن کا نام تاج الدین محمد سندھی ہے:

یک امامی ست در محلّتِ ما　　مثل او نیست یک امام این جا
نی خراسانی است ، نہ ہندی　　**تاج الدین محمد سندھی**(۸)

(ہمارے محلے میں ایک امام ہیں، یہاں ان جیسا کوئی امام نہیں ہے، ایسا امام نہ تو خراسان میں ہے اور نہ ہندوستان میں، وہ تاج الدین محمد سندھی ہیں۔)

ان کی اس رائے میں محبت و احترام کا مبالغہ بھی ہو تو بہ ہر حال تاج الدین سندھی کے علم و فضل، زہد و تقویٰ اور شخصیت کی جاذبیت کا بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح وہ جمعے اور عیدین کے خطبے کے مسائل بیان کرتے ہوئے، سرزمین ہند کے دو خطیبوں کا ذکر جمیل کرتے ہیں:

شمس الدین اور **قاضی علاء الدین**۔ شاعر، ان کے لحنِ داؤدی، علمی وجاہت، خدا ترسی و خدا شناسی کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ لفظ شمس کی رعایت سے شاعر کی مضمون آفرینی ملاحظہ کیجیے:

نامِ او را نہان کہ گرداند　　شمس پوشیدہ چون نمی ماند
نامِ او شیخ شمس ملت و دین　　آفتابِ سپہر و ماہِ زمین(۹)

(جس طرح شمس چھپا نہیں رہ سکتا اسی طرح ان کا نام بھی کب پوشیدہ رہے گا، ان کا نام شیخ شمس الدین (شمس الملت والدین) ہے، وہ آسمان کا آفتاب اور زمین کا چاند ہیں۔)

اسی طرح **قاضی علاء الدین** کا ذکر کرتے ہوئے انھیں جمعے اور عید کے خطبوں کی زینت قرار دیتے ہیں:

ہست قاضی علاء ملت و دین　　عید و آدینہ را بزیبد این
روی این روی عید را ماند　　بلکہ صد بار بہ از آن داند(۱۰)

(جمعہ اور عید کے خطبوں کے لیے قاضی علاء الدین ہی جچتے ہیں، ان کا چہرہ عید کے چہرے کی طرح ہے بل کہ اس سے سیکڑوں گنا بڑھ کر خوب صورت ہے۔)

مثنوی کے آخری حصے میں انھوں نے اپنے صاحب زادگان کو دینی اور اخلاقی نصیحتیں بھی کی ہیں۔ ان کے پانچ فرزندوں کے نام ذیل میں دیے جاتے ہیں:

عَلَم الدین، نجم الدین، عین الدین، صدر الدین اور شرف الدین۔

رکن الدین نے مثنوی کے اختتامی حصے میں اپنے اور اس اہم فقہی کتاب کے متعلق کچھ مزید اہم معلومات بھی دی ہیں جن سے اس کتاب کا سالِ تالیف، اس کے موضوعات اور اشعار کی تعداد کا پتا چلتا ہے، انھوں نے عمر کے کس حصے میں اس فقہی ماخذ کی شعری تخلیق کے لیے قلم اٹھایا اور اس کے لیے جدوجہد کی، ان سب کا ذکر بھی ذیل کے اشعار میں ملتا ہے:

اوّل از عمر خویش شرح دہم   پس بہ تاریخ نامہ، خامہ نہم
سال پنجاہ و شش قلم راندم   پس نشستم تمام گرداندم
پنج سال اندر این شدم مشغول   ہر روایت کہ دیدمی مقبول
سی صد و سی و پنج شد نامہ   عدد ابیات آورد خامہ
جملہ شد پانزدہ ہزار و دو صد   این روایت ببین برون ز عدد
ختم کردم بہ ہفتم شوّال   بود ہشتاد و پنج ہفصد سال(۱۱)

(پہلے میں اپنی عمر کے بارے میں بیان کروں گا پھر اس کتاب کا سال تالیف۔ ۵۶ برس کی عمر میں اس کتاب پر لکھنا شروع کیا اور ساٹھ سال میں پہنچ کر اسے مکمل کیا۔ میں نے ہر مقبول روایت کو اس میں درج کیا اور پانچ سال اسی کام میں مشغول رہا۔ یہ تین سو پینتیس ابواب پر مشتمل ہے اور اس کے اشعار کی کل تعداد پندرہ ہزار دو سو ہے۔ دیکھیے یہ روایت عدد سے باہر ہے، میں نے اسے ۷ شوّال ۷۸۵ھ / ۱۳۸۳ء میں مکمل کیا۔)

علّامہ رکن الدین دہلوی نے مثنوی نگاری کی قدیم روایت کے مطابق کتاب کا آغاز حمد، نعت اور وصفِ معراجِ رسولِ کریم ﷺ سے کیا ہے۔ اس کے بعد سلطان فیروز شاہ تغلق اور شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کی مدح کی گئی ہے۔ موضوعات کی ایک طویل فہرست ہے صرف چند ایک کے نام شامل کیے جاتے ہیں، جن میں اسلام کے بنیادی ارکان نماز، روزہ، زکوۃ اور حج بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ جنابتِ محرم، نکاح، نفقۂ زنان، طلاق، سوگ، نسب، عتاق، ایمان، سوگندِ کلام، قذف، حدِّ شرب، کیفیتِ قطع، جہاد، احکام اسیر ان، مالِ غنیمت، امان، علم واحکامِ آن، مسجد، سلام کردن وعلیک دادن،، کلام، امر معروف، سماع، کسب، ضیافت، لقیط نامہ، جعل آبق، شرکت، مضاربت، در بیانِ صید، در بیانِ اضحیہ،، وقف نامہ، ہبہ، بیع و شرا، ربوا، شفعہ، قسمت، اجارہ، قضا، شہادت، صلح، مضارعت، اکراہ، قصاص، دیّت، حلم، خُلق وغیرہ وغیرہ۔

انھوں نے ایک جگہ موضوعات کی رنگارنگی کا ذکر اس طرح کیا ہے:

صید گیرم ہمہ مسایلِ دین　　اسپ نی را در آورم در زین
دلدل طبع در کشم بہ لگام　　صید گیرم شوارد احکام(۱۲)

(میں قلم کے گھوڑے سے تمام دینی مسائل شکار کر کے انھیں شکار بند میں لے آتا ہوں۔ طبیعت کے گھوڑے کی لگام کھینچ کر عجیب وغریب فقہی احکام کا شکار کرتا ہوں۔)

نام ور محقق اور فارسی زبان و ادبیات کے استاد، پروفیسر ڈاکٹر غلام معین الدین نظامی (پ:۱۹۶۵ء) اس کتاب کی افادی خوبیوں کے متعلق لکھتے ہیں: یہ ضخیم مثنوی برصغیر کا ایک اہم اور قدیم فقہی ماخذ ہے۔ اگرچہ اس کا بہ راہ راست تعلق حنفی فقہی دبستان سے ہے لیکن اس میں کہیں کہیں دیگر فقہی مکاتب کی اختلافی آرا بھی مذکور ہیں جس سے موٴلف کی وسعتِ علمی، استحضارِ مسائل اور قدرتِ کلام کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ مثنوی فقہ وشعر واخلاق وعرفان کا دل پذیر امتزاج ہے۔ اسی سبب سے خود شاعر نے کئی مقامات پر اسے اپنا پندنامہ بھی قرار دیا ہے۔(۱۳)

مثال کے طور پر کچھ اشعار دیکھیے:

لب بہ توحیدِ او چو بگشایم　　پندنامہ از آن بیارایم(۱۴)

(میں پندنامہ کو خدا کی توحید بیان کر کے سجاتا سنوارتا ہوں۔)

ور بگویم تمام حکمِ نماز　　پندنامہ شود کتاب دراز(۱۵)

(اگر میں نماز کے تمام احکام بیان کروں تو یہ پندنامہ ایک ضخیم کتاب بن جائے گی۔)

من کہ این پندنامہ می گویم　　مُزد این از خدای می جویم(۱۶)

(یہ پندنامہ میں نے لکھا ہے اور میں خدا ہی سے اس کی اجرت طلب کرتا ہوں۔)

شاعر نے اس کتاب کو ایک جگہ **نامہٴ نادرہ** بھی کہا ہے، خود **طرفۃ الفقہا** کے نام کی شہادت بھی متن میں موجود ہے:

یادگاری است این کہ من کردم　　نامہٴ نادرہ بر آوردم
این ریاحینِ مجلس العلما ست　　نامِ این نامہ **طرفۃ الفقہا** ست(۱۷)

(میں نامہٴ نادرہ کو منصہ شہود پر لے کر آیا، یہ یادگار کام میں نے انجام دیا۔ یہ مجلس العلما کی مہکار ہے اور اس کا نام **طرفۃ الفقہا** ہے۔)

شاعر نے فقہی روایات جن کتابوں سے اخذ کی ہیں، ان کے نام بڑی ذمہ داری کے ساتھ جا بہ جا لکھے ہیں۔ ان کے چند منابع و مصادر کے نام ذیل میں دیے جاتے ہیں۔ یہ تمام کتب مستند و معتبر ہیں:

الجامع الصغیر، اوراد، اوضح، بدایہ، حمیدی، خانی، زاد، سراجی، شاشی، صاحبیہ، صلوۃِ مسعودی، فتاویٰ تاتار خانیہ، قدوری، کافی، کبرا، کنز، مجمع الفرایض، ملتقط، منظومہ، نافع، نہایہ، وافی، ہدایہ۔

انھوں نے ایک دو مقامات پر چشتی اور سہروردی سلسلے کی دو اہم کتابوں کو بھی اپنے فقہی ماخذ میں شامل کیا ہے۔ ان میں سے ایک **عوارف المعارف** (۱۸) ہے جب کہ دوسری **فوائد الفوأد** (۱۹) ہے، جسے فارسی کی ملفوظ نگاری میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

دیباچۂ اشربہ میں شعرا کی فضیلت کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے فارسی کے عظیم خمسہ نگار نظامی گنجوی (۱۱۴۱۔۱۲۰۹ء) کی **مخزن الاسرار** کا حوالہ بھی دیا ہے جس میں نظامی نے الہامی شاعری کو وحی کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ جس طرح اللہ نے انبیا کو معجزات عطا کیے ہیں تو شعرا کو ان کرامات سے نوازا ہے کہ وہ موزونی کلام سے لوگوں کے اذہان کو یک لخت منقلب کر دیتے ہیں۔ رکن کا کہنا ہے کہ شاعری ایک خارقِ عادت فنّ ہے۔ اس فن سے کوئی کوئی خوش نصیب ہی بہرہ ور ہوتا ہے:

ز آن کہ این فنّ خلافِ عادات است　　　شاعران را چنین کرامات است
از پسِ انبیا ہم ایشان اند　　　خامہ در **مخزن** این چنین رانند(۲۰)

(شاعری ایک غیر معمولی فنّ ہے، یہ کرامات شعرا کے حصے میں آئی ہیں۔ **مخزن الاسرار** میں اسے یوں بیان کیا گیا ہے کہ عظمت و بزرگی کے لحاظ سے انبیا کے بعد شعرا ہیں۔)

نظامی گنجوی کا وہ شعر ذیل میں دیا گیا ہے:

پیش و پسی بست صفِ کبریا　　　پس شعرا آمد و پیش انبیا(۲۱)

(اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں میں پہلے انبیا ہیں اور ان کے بعد شعرا۔)

انھوں نے متعدد مقامات پر اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ اس کتاب میں جو مسائل و معارف بیان کیے گیے ہیں وہ ان اہم فقہی اور عرفانی کتابوں اور اسلاف کے اقوال سے ہی اخذ کیے گئے ہیں، کچھ بھی اپنی طرف سے تحریر نہیں کیا گیا:

ہیچ از خویش بر زبان نارم　　　قولِ اسلاف را بیان دارم(۲۲)

(میں نے اسلاف کے اقوال کو بیان کیا ہے، کچھ بھی اپنی طرف سے زبان پر نہیں لایا۔)

فقہی کتابوں اور اسلاف کے اقوال کے علاوہ انھوں نے بعض معاملات کے بیان میں سرد و گرم چشیدہ لوگوں کے سبق آموز واقعات و تجربات کا ذکر بھی کیا ہے:

این همه آزموده آوردم　　　نه که از خویشتن بیان کردم(۲۳)

(یہ سب آزمائی ہوئی باتیں ہیں، یہاں کچھ بھی اپنی طرف سے بیان نہیں کیا گیا۔)

رکن ایک جیّد فقیہ تھے، اس حیثیت سے انھیں فارسی زبان کے ساتھ ساتھ عربی زبان پر بھی کامل دست رس حاصل تھی۔ انھوں نے جو مسائل بیان کیے انھیں بنیادی طور پر عربی ہی سے فارسی میں منتقل کیا گیا ہے:

هیچ از خویشتن نگفت استم　　　گرچه از نثر ، نظم بربستم
و آن که تازی به پارسی راندم　　　ذره ای بیش و کم نگردانم(۲۴)

(میں نے کچھ بھی خود سے بیان نہیں کیا، جو کچھ بھی عربی نثر میں تھا اسے فارسی نظم میں بیان کیا، اور اس میں ذرّہ بھر بھی کمی بیشی نہیں کی۔)

وہ بعض مقامات پر مسائل کی تفہیم میں عربی کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ ایک جگہ اس کی وجہ بھی بیان کرتے ہیں:

تازی و پارسی بیان آرم　　　تا ندانی که عجز از این دارم(۲۵)

(میں نے فارسی کے ساتھ ساتھ عربی کو بھی وسیلۂ اظہار بنایا ہے، کہیں آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں اسے بیان کرنے سے عاجز ہوں۔)

بعض مقامات پر وہ فارسی کا کوئی لفظ لکھتے ہیں اور اس کے متبادل عربی کا لفظ بھی لے آتے ہیں، تمکنتِ بیان ملاحظہ کیجیے:

نامِ این چاه را عطن خوانند　　　گر به تازی زبان بگردانند
چاهِ بزرگ بگو که را دارد　　　آب آن از شتر برون آرد
گر به تازی در این قلم رانند　　　ناضح آن چاه را همی خوانند(۲۶)

(اگر ہم کنویں کو عربی میں تبدیل کریں تو اسے عطن پڑھیں گے، وہ بڑا کنواں (رہٹ) جس کا پانی اونٹ کی مدد سے باہر لایا جاتا ہے، اسے ناضح پڑھا جائے گا۔)

رکن الدین کا کمال یہ ہے کہ وہ عبادات و معاملات کو عرفانیات کے دوش بہ دوش لے کر چلتے ہیں اور ایسے بدیع و لطیف نکات بیان کرتے ہیں جن سے صاحبِ ذوق لوگوں کی طبیعتیں کھل اٹھتی ہیں۔ ان کا ادہمِ فضل نہ صرف دیوانِ شرع میں سرخرو ہے بل کہ میدانِ تصوف میں بھی اس کی جولانیاں لائقِ دید ہیں۔ مثال کے طور پر:

عیدِ اضحی پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ تو در حقیقت دوست کی راہ میں اپنی خواہشات کا خون بہانا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح ایک جذبۂ جاں سپاری ہے۔ یہ عشق بازی سراسر جاں بازی ہے، اس معاملے میں عقل کی پیروی کرنا سود مند نہیں ہے، زاہد لوگ دوست کے رستے میں گائے بکریوں کا خون بہاتے ہیں جب کہ عاشق لوگ اس رستے پر اپنی جان اور خون سب کچھ قربان کر دیتے ہیں:

اضحیہ این ست گر کسی داند — در رہِ دوست خونِ خود راند
چون سماعیل جان فدا سازد — دشنہ در حلقِ خویش اندازد
عشق بازی تمام جان بازی ست — عقل سازی مدام بی سازی ست
عاشقان راہِ دوست قربان اند — زاہدان خون گاو وُبز رانند(۲۷)

پروانہ، جاں نثاری کا استعارہ ہے۔ کلاسیکی شاعری میں اس کا ذکر بیشتر انھی مثبت معنوں میں کیا گیا ہے۔ اس نامے کی طرفگی دیکھیے کہ کسی ایک جگہ بھی اس کو ان روایتی معنوں میں بیان نہیں کیا گیا۔ عشق بازی کے ساتھ مال بازی کی ترکیب بھی بہت خوب ہے۔

بذل و سخا پر گفتگو کرتے ہوئے **حاتم طائی** کا ذکر بھی کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

حاتمِ طی اگرچہ بی دین بود — چند با دین ز بذلِ او آسود
عشق بازی اگر کند شاید — مال بازی ز ہر کسی ناید
ہم چو پروانہ گرچہ جان بدہد — نیم نان در کفِ گدا ننہد
از سرِ جان بخاستند بسی — از سرِ سیم و زر نخاست کسی(۲۸)

(اگرچہ حاتم طائی غیر مسلم تھا لیکن کچھ مسلمان اس کی بخشش و سخا سے آسودہ حال تھے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص عشق بازی کرے لیکن مال بازی ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ لوگ پروانوں کی طرح جان تو دیتے ہیں لیکن آدھی روٹی گداگر کے ہاتھ میں رکھنا انھیں گوارا نہیں ہے۔ بہت سے لوگوں نے اپنی جانیں قربان کیں لیکن کسی نے بھی روپے پیسوں کی ہوس کو قربان نہیں کیا۔)

سماع کے موضوع پر فقہا، محدثین اور صوفیہ کی اختلافی آرا موجود ہیں۔ یہ اختلاف نظر اختلافِ روایات کی وجہ سے ہے۔ اس کے مخالفین اور حامی دونوں قرآن و حدیث سے استناد کرتے ہوئے اس کی حلّت و حرمت پر بحث کرتے ہیں۔ اس مثنوی میں بھی سماع کے مباحات اور مکروہات کا ذکر کیا گیا ہے۔ چشتی فقیہ نے اباحتِ سماع پر حضرت انس بن مالک (۶۱۲۔۷۰۹ء) کی ایک روایت بھی درج کی ہے۔ اسی طرح یہ بتایا گیا ہے کہ اگر سماع کا مقصد محض لہو و لعب ہے تو وہ حرام ہے اور اگر یہ وحشتِ نفس کو رفع کرنے کے لیے ہے تو جائز ہے۔ اسی طرح مختلف حالات و کیفیات جن میں سماع مباح قرار دیا گیا ہے، ان کا تفصیلی ذکر ہے۔ اس کے ساتھ کچھ کڑی شرائط بھی بیان کرتے ہیں۔ یہ وہ اہم شرائط ہیں جو بیشتر عرفانی متون میں ملتی ہیں اور صوفیہ کرام کا نقطہ نظر واضح کرتی ہیں:

امردی درمیانِ شان نبود ‌ ‌ ‌ فاسقی نیز اندر آن نرود
اہلِ دنیا ہم این چنین داند ‌ ‌ ‌ ملک و میر ہم بر این ماند
باز گوینده آن چنان باید ‌ ‌ ‌ بی غرض او سرود بسراید
اجرتی گر طمع نمی دارد ‌ ‌ ‌ آرزوی طعام می نارد
صوفیان نیز ہم چنین بایند ‌ ‌ ‌ میل سوی طعام ننمایند
وجد از کذب گر کسی راند ‌ ‌ ‌ آن ز غیبت قبیح تر داند
باز با این ہمہ اگر شنود ‌ ‌ ‌ ار **جنید** است آن روا نبود(۲۹)

(سماع میں بادشاہ، وزیر، فاسق یا ہیجڑا کوئی بھی موجود نہ ہو۔ اسی طرح قوّال بھی ایسا ہو جو ہر طرح کے معاوضے سے بے لوث ہو اور نہ ہی اسے کچھ کھانے پینے کا لالچ ہو۔ صوفیہ کو بھی رغبتِ طعام سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اگر مکر و فریب سے کوئی شخص وجد میں آتا ہے تو اس کے اس عمل کو غیبت سے قبیح تر جانیے۔

اگر ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے بھی کوئی سماع سنتا ہے تو اس کے لیے جائز نہیں ہے چاہے وہ جنید بغدادی ہی کیوں نہ ہوں۔)

رکن الدین، اکابر صوفیہ کی طرح رقصِ عوام کی ممانعت جب کہ رقصِ خواص کو مستحسن قرار دیتے ہیں:

رقص نااہل را نمی شاید　　طفل در معرکہ کجا آید
آن کہ کامل بود قدم بزند　　عیب او را در این کسی نکند
و آن کہ ناقص کند ہمہ نقصان ست　　کارِ ناقص تمام بی برہان ست
رقص کردن نہ کارِ ہر مرد است　　رقص آن کس کند کہ بادرد است(۳۰)

(نااہل کے لیے رقص جائز نہیں ہے، میدانِ جنگ میں بچے کا بھلا کیا کام۔ کامل شخص ہی اس میدان میں قدم رکھے، کوئی بھی اس کی ممانعت نہیں کرے گا۔ اگر ناقص آدمی رقص کرے تو یہ اس کے لیے سراسر نقصان دہ ہے کیوں کہ اس کے تمام کام بغیر کسی دلیل کے ہیں۔ رقص کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے، یہ کام تو صاحبِ درد کو ہی زیب دیتا ہے۔)

وہ معاشرتی خرابیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے غیبت کو فساد کی جڑ قرار دیتے ہیں۔ ایک اچھے مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے بھائی کے لیے ہمیشہ کلمۂ خیر ہی کہے اور اس کی عیب جوئی سے پرہیز کرے۔ وہ سادہ لوح جن کا پسندیدہ شغل لوگوں کے گھروں میں جا جا کر اپنے عیبوں کو بیان کرنا ہوتا ہے انھیں ایک جگہ تنبیہ کرتے ہیں:

خانۂ ہر کسی قدم نزند　　سرّ خود کشف پیش کس نکند
خانۂ مردمان ہمہ خواری ست　　خانۂ خویشتن جہان داری ست(۳۱)

(ہر ایک کے گھر جانا مناسب نہیں ہے، اپنے راز کسی کے سامنے بیان نہیں کرنے چاہیے، بادشاہت اپنے گھر ہی میں ہے، لوگوں کے گھروں میں جانا تو سراسر ذلت ہے۔)

ایک اور جگہ اسی حوالے سے لکھتے ہیں:

ستر در عیبِ خلق خوش ہنری ست　　کشف در عیب کارِ بی خبری ست(۳۲)
عیب بر خلق ، عیبِ خود داند　　عیبِ خود کشف کس نگرداند(۳۳)

(لوگوں کے عیب چھپانا تو خوبی کی بات ہے، ان کے عیبوں کو ظاہر کرنا کم عقلی کی دلیل ہے۔ لوگوں کی عیب جوئی کو اپنا عیب سمجھنا چاہیے، کوئی بھی شخص اپنے عیبوں کو کب ظاہر کرتا ہے۔)

درویش منش رکن الدین خود بھی ساری عمر اسی زریں اصول پر کاربند رہے، ایک اور جگہ وہ یوں لکھتے ہیں:

خاصہ خود **رکن** را کہ عہد خداست   در چپ و راست او بر این دو گواہ ست
ہیچ وقتی بہ قدّح دم نزند   ہجو از بہر ہیچ کس نکند
آن سعادت بدو خدای چو داد   می نشاید بہ بد قلم بنہاد(۳۴)

(رکن الدین، کا اللہ تعالیٰ سے یہ عہد ہے اور وہ ان دو باتوں کا گواہ ہے کہ رکن کبھی کسی کی عیب جوئی نہیں کرتا اور نہ ہی کسی کی ہجو کرتا ہے۔ جب خدا نے اسے (شاعری) کی سعادت سے نوازا ہے تو اسے زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے قلم سے کسی کی برائی بیان کرے۔)

اتنی ضخیم کتاب میں جہاں بعض مقامات پر انھوں نے اپنے ہم عصروں سے سنے ہوئے واقعات بیان کیے ہیں اور ان میں معاشرے کی عمومی اخلاقی گراوٹ اور لوگوں کی خود پسندی، مکر و فریب، بد دیانتی اور بے وفائی کا ذکر ہے۔ ایسے بہت سے مواقع ان کے ہاتھ آئے جن میں وہ اپنے کسی حریف کو نیچا دکھانے کے لیے اس کی ہجو کر سکتے تھے لیکن ان کا سینہ جو حقیقی معنوں میں خانقاہِ درویشاں(۳۵) تھا، اس کے برے اثر سے محفوظ رہا اور انھوں نے زبانِ قلم کو کسی کی ہجو سے آلودہ نہیں کیا۔

صرف ایک مقام پر جہاں وہ غلاموں کو خریدنے اور آزاد کرنے کے متعلق چند احتیاطوں کا ذکر کرتے ہیں، وہاں **شیخ دولت یار** نامی ایک آزاد کردہ غلام کی بڑے معصومانہ انداز میں سرزنش کرتے دکھائی دیتے ہیں، جس نے ان کے حسنِ سلوک سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے:

آن ندیدی کہ **شیخ دولت یار**   ہیچ وقتی مرا نیامد کار
شرمِ اسلاف ہم نمی کردی   روحِ ایشان ہمیشہ آزردی
گورِ شان گل گہی نمی بردی   آب ہم روح شان نمی خوردی
ہیچ ما را بہ جا نیاوردی   التفاتی ز ما نمی کردی
دیگران زو حرام خوار تر اند   نامِ شان بر سرِ زبان نبرند

نام ہر یک اگر قلم رانم روی دفتر سیاہ گردانم
بلکہ من شرم روی شان دارم ز آن سبب در قلم نمی آرم(۳۶)

(تم نے نہیں دیکھا کہ وہ شیخ دولت یار جو کبھی میرے کام نہیں آیا، اسلاف کا شرم وحیا اسے نہیں ہے بل کہ اس نے تو ہمیشہ ان کی روح کو دکھ اور تکلیف ہی پہنچائی ہے۔ کبھی ان کی قبر پر پھول نہیں لے کر گیا، حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ان کی پاکیزگی سے محروم ہے۔اس نے نہ تو کبھی ہمیں یاد کیا اور نہ ہی کبھی کوئی محبت و التفات۔ باقی غلام تو اس سے بھی بڑھ کر حق ناشناس ہیں، ان کا ذکر ہی نہیں کرنا چاہیے۔ اگر میں ہر ایک کے بارے میں بات کرنے لگوں تو یہ دفتر سیاہ ہو جائے گا۔ مجھے ان سب کا حیا ہے، اسی لیے میں ان کا ذکر نہیں کرتا ہوں۔)

جبر وقدر کے پیچیدہ نکات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان ہرگز بھی عدیم الاختیار نہیں ہے۔ اللہ نے جست وجو کا مادہ اسے ودیعت فرمایا ہے، اسے چاہیے کہ کاہلی سے دور رہ کر مقصد کی جست وجو میں سرگرم عمل رہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے خلعتِ اختیار پہنائی ہے۔ اگر خوش بختی کے دروازے قفل زدہ ہیں تو ان کی کلید بھی انسان ہی کے ہاتھوں میں رکھ دی گئی ہے، اسے چاہیے کہ خوف ورجا کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دے کیوں کہ یہ دولت نہ تو انسان کو مطلق العنان بننے دیتی ہے اور نہ ہی اسے محکوم، بل کہ وہ دائرہ شریعت میں رہتے ہوئے حصولِ مقاصد کی پسندیدہ کوشش کرتا ہے:

خلعتِ اختیار پوشانید شربتِ جست و جوی نوشانید
بر درِ بختِ من چو قفل نہاد در کفِ دستِ من کلید بداد(۳۷)
کار در خوف و در رجا داند مشکلِ این کہ حلّ گرداند(۳۸)

مثنوی میں علم کے احکامات کا بیان شامل ہے اس کے علاوہ علمِ کلام، علمِ اصول، علمِ معرفت، علمِ فقہ اور علمِ طب کی فضیلتوں کا ذکر جامع انداز میں کیا گیا ہے۔ شاعر علما سے محبت اور ان کی مجالس میں شرکت کا درس دیتے ہیں۔ اہل علم کی عوام الناس پر برتری کو ایک جگہ یوں بیان کرتے ہیں:

عالمی در حمایتِ علما ست خوابِ ایشان عبادتِ جہلا ست
مقبلان، اہل علم را گویند و آن کسان را کہ علم می جویند(۳۹)

(ایک جہان علما کا طرف دار ہے، علما کا سونا، جہلا کی عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ اللہ کے برگزیدہ بندوں میں اہلِ علم ہیں یا پھر وہ لوگ جو علم کے متلاشی ہیں۔)

یہ نصیحت بھی کرتے ہیں کہ جب علم کمال کو پہنچ جائے تو صرف اسی پر اکتفا کر لینا مناسب نہیں ہے۔ علم کے ساتھ عمل بڑی دولت ہے۔ اس کے لیے خود کو کسی کامل کے سپرد کرنا ضروری ہے:

علم حاصل چو بر کمال کند   دست در دامنِ عمل بزند
سرِ خود زیرِ پای پیر نہد   کُو ہدایت بہ گمرہان بدہد(۴۰)

(جب تمھیں علم میں کمال حاصل ہو جائے تو اس پر عمل کرو، اپنے سر کو مرشد کے قدموں میں رکھو جو گمراہوں کو ہدایت دیتا ہے۔)

علمِ نعمانی اور زہدِ قرنی کی تعریف کی گئی ہے۔

مثنوی کے آخری حصے میں تحصیلِ حلم کو تحصیلِ علم سے مشکل قرار دیتے ہیں۔ یہ دو صفات اگر کسی شخص میں مجتمع ہو جائیں تو اس کا معاملہ نور علیٰ نور سمجھیے۔ صفتِ حلم کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

این صفت چون بہ ذاتِ پاکِ خداست   ذرہ ای ز آن، آن دو کون بہاست(۴۱)

(چوں کہ حلم ایک خدائی صفت ہے، اس کا ایک ذرہ بھی دو جہاں کی قیمت کے برابر ہے۔)

کہتے ہیں کہ شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی اس صفت سے متصف تھے:

این سعادت بہ شیخ روی نمود   قطبِ عالم نصیر دین محمود(۴۲)

(یہ خوش بختی شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی میں موجود تھی۔)

عجز و انکسار کی عظمت پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خود کو مٹی کی طرح حقیر جانو کیوں کہ اس میں جو بڑائی ہے وہ نرالی ہے اگر اس نکتے کو سمجھنا ہے تو تیمّم پر غور کرو کہ مٹی کو پانی کے متبادل استعمال کیا جاتا ہے۔ مٹی کی طرح عاجزی دکھانے والا شخص میٹھے چشمے سے بہتر ہے۔ اگر مٹی فروتنی کا مظاہرہ نہ کرتی تو پانی کے مقابل کب آتی اور اس کا شرف ملاحظہ ہو کہ انسان کی خلقت بھی مٹی ہی سے ہے۔ اب اگر وہ خاک بن کر رہے تو پاک ہے اور اگر ابلیس کی طرح مغرور بن جائے تو آبِ انگور (شراب) کی طرح پلید ہی کہلائے گا۔

خویشتن را چو خاکِ راہ داند   ہیچ چیزی بدین نمی ماند
در تیمّم ببین چہ می آرد   خاک را ہم چو آب می دارد

هر که چون خاک پایمال شود   بهتر از چشمهٔ زلال شود
ورنه خود خاک، آب کی گردد   گر به بی چارگی نمی ورزد
خلقتِ آدمی چو از خاک است   گر شود هم چو خاک خود پاک است(۴۳)
ور چو ابلیس می شود مغرور   او پلید است هم چو آب انگور(۴۴)

مٹی کی پانی پر برتری جتانے کے لیے یہاں آبِ انگور سے زیادہ موزوں لفظ اور کیا ہو سکتا تھا۔

حقائق و معارف کے بیان میں ان کا قلم کہیں تکان نہیں دکھاتا۔ ایک مضمون کو سو ڈھنگ سے باندھتے ہیں۔ بزرگوں کے پند و نصائح کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ دولت سعادت مند کے حصے میں آتی ہے، ہر شخص کو اس کا اہل نہیں سمجھنا چاہیے اور نہ ہر ایک سے یہ توقع رکھنی چاہیے کہ وہ ان پر عمل پیرا ہو گا:

هر مسیحی بر آسمان نرود   هر **براهیم** بت شکن نشود
هر مگس انگبین نمی ریزد   لعل هر کوه هم نمی خیزد
دُر در هر صدف نمی جویند   جمله دریا صدف نمی پویند
کانِ زر هر زمین نمی یابد   مهر هر آسمان نمی تابد
نافه هر آهویی نیندازند   عشق هر آدمی نمی بازند(۴۵)
بهر اکسیر هر گیاهی نیست   هر گهر، تاجِ پادشاهی نیست
نه به هر چشمه آبِ حیوان است   نه به هر ابر قطره نیسان است
کور را آینه چه بنمایند   پیشِ اخرس زبان چه بگشایند(۴۶)

(ہر مسیح آسمان پر نہیں جاتا اور نہ ہی ہر ابراہیم بت شکن ہوتا ہے۔ ہر مکھی شہد نہیں لٹاتی لعل و جواہر کب ہر پہاڑ میں ہوتے ہیں۔ سمندر کے تمام سیپ تلاش کرنا مناسب نہیں کیوں کہ ہر سیپ میں موتی نہیں ہوتا۔ اسی طرح سونے کی کان بھی ہر زمین میں تلاش کرنا حماقت ہے۔ سورج ساتوں آسمانوں میں تھوڑی چمکتا ہے۔ مشک ہر ہرن کی ناف میں نہیں رکھی گئی، عشق بازی ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ ہر جڑی بوٹی اکسیر کا درجہ نہیں رکھتی، ہر موتی بادشاہ کے تاج کی زینت نہیں بن سکتا۔ ہر چشمہ آبِ حیات نہیں کہلاتا،

نہ ہی ہر بادل آبِ نیسان برساتا ہے۔ اندھے کو آئینہ کیوں کر دکھایا جائے، بھلا گونگے سے بات چیت کا بھی کوئی فائدہ ہے۔)

اگرچہ نصائح ایک روکھا پھیکا مضمون ہے لیکن انھوں نے استادانہ چابک دستی سے اسے شہد و شکر جیسا لذیذ بنایا ہے۔ ان کی ہر بات میں ایک بات ہے۔ ہر شعر میں ایک جہانِ معانی آباد ہے۔ اس میں ان کی زورِ طبیعت اور جمالیات کا گہرا اثر موجود ہے۔ وہ ایک مقام رسیدہ، صاحبِ ذوق فقیہ ہیں اور یہ بات بہ جائے خود عجائبِ روزگار میں سے ہے۔ مثنوی **طرفۃ الفقہا** میں بچوں، جوانوں اور سال خوردہ لوگوں کے لیے کارآمد نصیحتیں ہیں۔ جوان لڑکوں کو رشتے کے انتخاب میں کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے، اور بیوی کیسی ہونی چاہیے، اس سلسلے میں انھوں نے سراپائے محبوب کا عمدہ نقشہ کھینچا ہے۔ اس کے چند اشعار متن میں شامل کیے جاتے ہیں جو ان کے ذوقِ جمالیات کے آئینہ دار ہیں:

سرو قدّی ، سمن پری جوید   سیم ساقی ، شکر لبی پوید
شب درازی ز زلف او ببرد   نافہ از شرم زلف خون بخورد
چون سر زلف خویش بگشاید   ہر طرف اژدہا پدید آید
آن زمانی کہ مو گشادہ کند   مار از رشک دست و پا شکند
آہو از چشم او پدید آید   آن چنان چشم آہویی باید(۴۷)
آہو از چشم شرم او میرد   ترک شہر او از این سبب گیرد
ہر کہ بادام چشم او نگرد   بیش بادام را دگر نخرد
چون پلک را بہ یک دگر بزند   خانۂ مردمان خراب کند
نیم شب چون نقاب برفگند   آتش روی او بہ شمع زند
شمع از شرم روی او سوزد   شمع را سوختن کہ آموزد
لالہ از شرم طشت خون شیند   سرخی روی او اگر بیند(۴۸)
غبغب او ترنج را ماند   چاہ بابل چہ زنخ داند(۴۹)

(سرو قد اور گلِ یاسمین کی طرح خوب صورت، سیم ساق اور شکرّلب تلاش کرنی چاہیے، اس کی زلفیں درازئ شب کو فیض یاب کریں، ہرن کی ناف اس کی زلفِ مشک بار سے شرمندہ ہو کر خون کے گھونٹ پیے۔

جب وہ زلفِ پریشان کو لہرائے تو ہر طرف اژدھے ہی اژدھے نظر آنے لگیں اور سانپ رشک کے مارے اپنے ہاتھ پاؤں کاٹ کھائیں، ایسی غزال چشم ہو کہ اس کی آنکھوں سے ہرن نظر آئیں۔ ہرن اس کی آنکھوں کی خوب صورتی سے شرم کے مارے شہر کو خیر آباد کہیں۔ اس کی بادامی آنکھوں کو جو کوئی دیکھے، اس کے بعد وہ بادام خریدنے کا محتاج نہ رہے۔ وہ اپنی پلکوں کی جنبش سے گھر کے گھر خراب کرے۔ آدھی رات کو نقاب الٹے تو اس کا آتشیں چہرہ شمع کو روشن کرے۔ شمع نے اس کے چہرے سے جلنا سیکھا ہے، وہ اسے دیکھے تو جل جاتی ہے۔ لالہ کا پھول اس کے چہرے کی سرخی کو دیکھ لے تو شرم سے خونی تھال ہی میں پڑا رہ جائے۔ اس کی گردن ترنج کی طرح خوش گوار ہونی چاہیے، اس کے ٹھوڑی کے کنوے کو چاہِ بابل سمجھے۔)

یہ مثنوی بہ جا طور پر عبادات و معاملات، شعر و اخلاق و عرفان کا مرقّع جمال ہے۔ یقیناً یہ نادر کتاب شاعر کے بقائے نام کی ضمانت ہے۔ وہ علمی و عرفانی خزانوں کے متلاشیوں کو اس کتاب کے پڑھنے کی دعوت بھی دیتے ہیں:

گر کسی گنج را طلب دارد   باید این پندنامہ را خواند
گنج ہای جہان در این مدفون   ہر یکی بیت چون دُر مکنون(۵۰)

(اگر کسی شخص کو خزانے کی تلاش ہے تو اسے یہ پند نامہ پڑھنا چاہیے، اس میں دنیا بھر کے خزانے دفن ہیں اور اس کا ہر ہر شعر مروارید ہے۔)

وہ جا بہ جا مقامی محاورات کا بھی بر محل استعمال کرتے ہیں۔ اس اجتماعی عوامی دانش کی چند مثالیں دی جاتی ہیں:

پنج انگشت ہم برابر نیست(۵۱)
(پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔)
ہم بہ یک چوب ہر دو می راند(۵۲)
(ایک ہی لاٹھی سے دو کو ہانکنا)
گل نباشد مگر کہ در گلشن(۵۳)
(پھول، باغ ہی میں اچھے لگتے ہیں۔)

جامِ نوکیسہ را کسی نکشد   چربی از دیگ نو کسی نچشد(۵۴)

(جس کے پاس نئی نئی دولت آئی ہو، اس کے ہاتھ سے تو کوئی جام بھی نہیں پیتا، نئی نویلی دیگ سے چربی کون چکھتا ہے۔)

هر کجا شهد بیشتر مگس است (۵۵)

(جہاں شہد ہو وہاں مکھی ہوتی ہے۔)

آن چه قسمت بود همان یابم (۵۶)

(قسمت میں لکھا مل کر رہتا ہے۔)

گنج بی رنج دست می ناید (۵۷)

(بغیر مشقت کے خزانے ہاتھ نہیں آتے۔)

شسته در خانه کس نمی یابد (۵۸)

(گھر بیٹھے ہوئے کو کچھ نہیں ملتا۔)

وہ کلاسیکی فارسی شعرا جو عربی زبان وبیان کے رموز سے بہ خوبی آگاہ ہیں، اُن کے کلام میں عربی ادبیات کے گہرے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کے دواوین میں عربی الفاظ وتراکیب کی کثرت ہے۔ اس عربی دانی نے ان کے زبان وبیان کو ضرورت سے زیادہ درشت اور ناہموار بنادیا ہے۔

علّامہ رکن الدین کو اس معاملے میں استثنائی حیثیت حاصل ہے۔ مثنوی میں بعض ایسے اشارات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے فارسی ادب کے ساتھ ساتھ زمانۂ جاہلیت کے عربی ادب کا بھی گہرا مطالعہ کر رکھا ہے۔ وہ شیخ سعدی شیرازی (۱۲۹۲ء) اور خاقانی شروانی (۱۱۲۶۔۱۱۸۵ء) کے ساتھ ساتھ امرء القیس (۱۱۴۹ء) کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے کسی بھی جگہ اپنی عربی دانی کو فخر ومباحات کا باعث نہیں سمجھا، اور نہ ہی کوئی ایسی فخریہ بات کہی کہ "من بسی دیوانِ شعر تازیان دارم زبر"۔(۵۹)

ان کا کمالِ فن تو یہ ہے کہ انھوں نے عربی لغات وتراکیب کو بھی برصغیر کی خالص فارسی کا رنگ بخشا ہے۔ جہاں کہیں عربی کی نامانوس لغات آئی ہیں وہاں ان کی مناسب تفہیم بھی کی گئی ہے۔ آیاتِ قرآنی، احادیثِ نبوی اور عربی امثال سے بھی استشہاد کیا گیا ہے، لیکن اس میں بھی اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا گیا۔

یہ ضخیم مثنوی دفتر مرموز بھی بن سکتی تھی۔ جیسا کہ بعض شعرا فضل فروشی کا بازار گرم کرتے ہیں اور ابلاغ کو ہنر نمائی پر قربان کر دیتے ہیں۔ یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے، چشتی فقیہ کی مشربی ترجیحات میں ان تکلفات کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ ان کے ذوقِ سلیم اور فکرِ مستقیم نے دقیق مسائل کو بھی سادہ اور دل پذیر انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ فقہ کی موضوعاتی اصطلاحات کے لغوی اور اصطلاحی معانی بھی بیان کرتے ہیں تاکہ پڑھنے والے کو دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ تسہیل مطالب ان کے لیے اسی وجہ سے بھی اولویت رکھتی ہے کہ اُن کا بنیادی دائرۂ تخاطب طبقۂ طلبا ہے۔

علامہ رکن الدین ایک اچھے داستان طراز ہیں، بعض مقامات پر دینی مسائل و معاملات میں بر محل چھوٹی یا بڑی سبق آموز کہانیاں بھی بیان کرتے ہیں۔ جو اُن کے تربیتی نکات کی نمائندگی کرتی ہے۔ داستان پردازی میں اُن کا اسلوب جالبِ توجہ ہے۔ مثنوی میں بعض مقامات پر مقامی اثرات بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ وہ بیشتر جگہوں پر ویرانی کو بیرانی اور آبادی کو آبادانی لکھتے ہیں۔ رکعت، قران، قرات اور حنفی جیسے الفاظ کا مقامی تلفظ برتتے ہیں۔ بعض الفاظ کی ''ہ''تلفظ میں نہیں آتی۔ اسی طرح الفاظ کی جمع کو بہ طور واحد بھی استعمال کرتے ہیں۔ بعض مصرعوں اور اشعار کا تکرار بھی موجود ہے۔

فقہی مسائل کے ساتھ جابہ جا مشفقانہ پند واندرز ان کا منفرد اسلوب ہے۔ کوئی بات ایسی نہیں جو ملالِ طبع کا باعث بنے۔ اصالتِ احساس اور جزالتِ فکر نے مثنوی کی اثر انگیزی میں بے حد اضافہ کیا ہے۔

طرفۃ الفقہا کے تین مخطوطے موجود ہیں۔ ایک خطی نسخہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے مرکزی کتب خانے میں ہے۔ اس کا شمارہ ۱۶۸۵/۳۸۷۴ ہے۔ اس کی کتابت آٹھویں صدی ہجری میں قدیم رسم الخط میں ہوئی۔(۶۰) اس کے عناوین سرخ روشنائی سے لکھے گیے ہیں۔ کاتب نے بعض مقامات پر اشعار کو متن کے حاشیے میں درج کیا ہے۔ حاشیے میں بعض جگہوں پر قرآنی آیات و احادیث بھی لکھی گئی ہیں۔ اس کے آخری چند صفحات دست برد زمانہ کی نذر ہو چکے ہیں۔ اسی طرح بعض صفحات کرم خوردہ ہیں۔ ترقیمہ ضائع ہو جانے سے کچھ قیمتی معلومات بھی تلف ہو گئی ہوں گی۔

ایک نسخہ نیشنل میوزیم، کراچی میں موجود ہے۔ اس کا شمارہ ۴۷۔۱۹۶۷ .N.M ہے۔ یہ نستعلیق خط میں لکھا گیا ہے۔ اس کے صفحات کی تعداد چار سو بارہ ہے۔ اس کی کتابت ۲ ربیع الاول ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء میں ہوئی۔(۶۱)

کتاب خانہ گنج بخش، اسلام آباد میں موجود نسخے کا شمارہ ۱۲۰۴۳ ہے اور اس کی کتابت ۱۰ ویں صدی ہجری میں اچھے نستعلیق خط میں ہوئی ہے۔ مجموعی طور پر اس کی حالت ابتر ہے۔ بیشتر صفحات ضائع ہو چکے ہیں جو صفحات موجود ہیں سبھی کرم خوردہ ہیں۔(۶۲)

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) محمد رضا ربیعیان، دانشنامہ ادب فارسی بہ سر پرستی حسن انوشہ،(ایران: چاپ و انتشارات وزارت فرہنگ و ارشاد اسلامی)، ۱۲۷۰۔

(۲) رکن الدین، طرفۃالفقہا، نسخہ خطی،(لاہور: پنجاب یونیورسٹی، لاہور)، شمارہ۱۶۸۵/ ۳۸/ ۴۷۳۸، ۱۶۔

(۳) ایضاً، ۱۸۔

(۴) ایضاً، ۲۲۔

(۵) ایضاً، ۲۱۔

(۶) ایضاً، ۴۱۔

(۷) ایضاً، ۳۳۳۔

(۸) ایضاً، ۱۲۷۔

(۹) ایضاً، ۱۳۹۔

(۱۰) ایضاً، ۱۴۶۔

(۱۱) سید عارف نوشاہی، فہرست نسخہ ہای خطی فارسی موزہ ملی پاکستان، (اسلام آباد: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، ۱۹۸۶ء)، ۸۳۶۔

(۱۲) رکن الدین، طرفۃ الفقہا، ۶۶۴۔

(۱۳) معین نظامی، استاد شعبہ فارسی، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

(۱۴) رکن الدین، طرفۃالفقہا، ۱۔

(۱۵) ایضاً، ۲۰۵۔

(۱۶) ایضاً، ۷۶۳۔

(۱۷) ایضاً، ۳۳۔

(۱۸) ایضاً، ۵۸۲۔

(۱۹) ایضاً، ۶۹۷۔

(۲۰) ایضاً، ۸۸۸۔

(۲۱) نظامی گنجوی، کلیات نظامی گنجوی، بہ تصحیح وحید دستگردی،(ایران: مؤسسہ انتشارات نگاہ، ۱۹۷۷ء)، ۳۳۔

(۲۲) رکن الدین، طرفۃالفقہا، ۳۰۔

(۲۳) ایضاً، ۶۹۷۔

(۲۴) ایضاً، ۳۵۔

(۲۵) ایضاً، ۸۱۵۔

(۲۶) ایضاً، ۸۸۱۔

(۲۷) ایضاً، ۶۷۸۔

(۲۸) ایضاً، ۶۹۶۔
(۲۹) ایضاً،۵۸۱۔
(۳۰) ایضاً، ۵۸۳۔
(۳۱) ایضاً، ۱۰۲۹۔
(۳۲) ایضاً، ۸۲۳۔
(۳۳) ایضاً، ۸۲۴۔
(۳۴) ایضاً، ۸۸۵۔
(۳۵) ایضاً، ۶۸۹۔
(۳۶) ایضاً، ۴۶۵۔
(۳۷) ایضاً، ۷۵۸۔
(۳۸) ایضاً، ۵۹۷۔
(۳۹) ایضاً،۵۵۸۔
(۴۰) ایضاً، ۵۵۹۔
(۴۱) ایضاً، ۱۰۱۹۔
(۴۲) ایضاً، ۱۰۱۹۔
(۴۳) ایضاً،۱۰۲۳۔
(۴۴) ایضاً، ۱۰۲۴۔
(۴۵) ایضاً،۲۴۔
(۴۶) ایضاً، ۲۵۔
(۴۷) ایضاً،۳۹۸۔
(۴۸) ایضاً،۳۹۹۔
(۴۹) ایضاً،۴۰۱۔
(۵۰) ایضاً، ۳۶۔
(۵۱) ایضاً،۲۷۔
(۵۲) ایضاً،۱۱۴۔
(۵۳) ایضاً،۳۵۷۔
(۵۴) ایضاً،۳۹۲۔
(۵۵) ایضاً،۶۹۷۔
(۵۶) ایضاً، ۷۵۶۔
(۵۷) ایضاً،۶۲۷۔
(۵۸) ایضاً،۶۳۷۔

(۵۹) منوچہری دامغانی، دیوان استاد منوچہری دامغانی، بہ کوشش: محمد دبیر سیاقی، (تہران: چاپ خانہ پاکت چی، ۱۹۰۸ء)۔

(۶۰) احمد منزوی، فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان، جلد ۷، (اسلام آباد: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، ۱۹۸۶ء)، ۴۴۳ ۔

(۶۱) سید عارف نوشاہی، فہرست نسخہ ہای خطی فارسی موزہ ملی پاکستان، (اسلام آباد: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، ۱۹۸۳ء)، ۸۳۶۔

(۶۲) احمد منزوی، فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان، ۴۴۳۔

BIBLIOGRAPHY

- Ahmad Munzavi, *Fehrist-i Mushtarak-i Nuskha hay-i Khaṭṭi- ye Fārsī- ye Pākistān*, (Islamabad, Iran – Pakistan Institute of Persian Studies, 1987).
- Dr. Ghulam Moeen ud Din Nizami, Professor of Persian, University of the Punjab, Lahore.
- Muhammad Raza Rabi'eyan, *Dānish Nama Adab-i Fārsī*, (Intesharat Wazarat i Farhang wa Irshad i Islami, 1960)
- Nizami Ganjavi, *kulliyāt-i Nizāmī Ganjavī*, (Instisharat Nigah,1977)
- Rukan Al-Din, *Turfat-ul Fuqahā*, (Lahore: Shirani Collection, Central Library, University of The Punjab, MS no. 4738/1685.
- Syed Arif Naushahi, *Fehrist-i Nuskha hay-i Khaṭṭi-ye Fārsī Mozay Miīi Pākistān*, (Islamabad, Iran – Pakistan Institute of Persian Studies,1986)

❖❖❖